آپ تو ایسے نہ تھے

(ناولٹ)

ڈاکٹر یاسمین اختر

آپ تو ایسے نہ تھے

(ناولٹ)

ڈاکٹر یاسمین اختر

AAP TO AISE NA THE (Novelet)

By: Dr.Yasmin Akhtar

Year of Publications: 2015

کتاب کا نام : آپ تو ایسے نہ تھے

صنف : ناولٹ

مصنفہ و ناشر : ڈاکٹر یاسمین اختر

پتہ: معرفت محمد فخر عالم، ٹینک لین، ۳۔بھیکن پور، بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۱

ضخامت : ۵۶/صفحات

قیمت : ۱۰۰/روپے

تعداد : ۵۰۰سو

سن اشاعت : ۲۰۱۵ء

کمپوزنگ : افتخار عظیم چاند (پٹنہ)

رابطہ:(1)9504890054&(2)9631783990

ترتیب و تزئین : رضیہ بیگم (مینو)، بھاگلپور

مطبع :صائمہ پبلی کیشن، احمد مارکیٹ، لنگر ٹولی پٹنہ۔۴

ملنے کے پتے:

(۱) ڈاکٹر یاسمین اختر، معرفت محمد فخر عالم، ٹینک لین، ۳۔بھیکن پور، بھاگلپور (بہار)

(۲) گلاب ٹینٹ ہاؤس، ۳۔بھیکن پور (بٹیا)، بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۱ (بہار)

(۳) نیو کتاب منزل، تاتار پور چوک، بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۲ (بہار)

(۴) بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴ (بہار)

(۵) جناب افتخار عظیم چاند، ''اقبال ہاؤس''، نزد میواساؤ حلوائی، سلطان گنج، پٹنہ۶

اِنتساب

اُردو زبان وادب کے اُن تمام اُدبا و شعراء

کے نام

جو اپنے خونِ جگر سے بے لوث آبیاری کر رہے ہیں

اور

اس کو سینچ کر اس کے فصل کو لہلہا رہے ہیں،

جن کی بدولت آج اُردو زبان

مثلِ آفتاب روشن، درخشاں اور تابندہ ہے۔

--------- ڈاکٹر یاسمین اختر

نوٹ:۔ اس ناولٹ ''آپ تو ایسے نہ تھے'' میں شائع شدہ تمام کردار، مقامات، واقعات بالکل فرضی اور خیالی ہیں لہذا کسی سے کوئی مماثلت، مطابقت، یا موافقت محض اتفاقیہ ہی ہو سکتی ہے، جس کے لئے ناولٹ کی مصنفہ، ناشر اور پرنٹر و پبلیشر پر کوئی بھی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر یاسمین اختر

آپ تو ایسے نہ تھے

(ناولٹ)

حرفِ اوّل

پیشِ نظر ناولٹ ''آپ تو ایسے نہ تھے'' ڈاکٹر یاسمین اختر کی بالکل تازہ پیش کش ہے۔ میں نے ڈاکٹر یاسمین اختر کے ناولٹ ''آپ تو ایسے نہ تھے'' کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ میں نے ان کے بیش تر افسانوں کو پڑھا ہے۔ ان کے افسانے اور ناولٹ نہایت ہی متاثر کن اور دل کو چھو لینے والے ہوتے ہیں۔ اور ان سے معاشرے کی اصلاح بھی خوب ہوتی ہے۔ موصوفہ کے ناولٹ اور کہانیوں کا اختتام بڑا ہی دلچسپ، دل پذیر، حیرت واستعجاب سے بھرپور اور ڈرامائی ہوتا ہے۔ ان کے ناولٹ اور افسانے کو پڑھ کر قاری دیر تک حیرت واستعجاب اور غور وفکر کے بحر میں ہچکولے کھانے لگتا ہے اور تا دیر رونما ہونے والے وقوعوں میں کھو جاتا ہے۔

ڈاکٹر یاسمین اختر کے ناولٹ ''آپ تو ایسے نہ تھے'' کی کہانی شوہر اور بیوی کے دیرینہ رشتے، دونوں کے والہانہ لگاؤ اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے درمیان گھومتی نظر آتی ہے اور دونوں کے مضبوط اور باہمی رشتے کے جھولے میں جھولتی ہے کہ اسی دوران ایک نوجوان جس کا نام راشد ہے، ان دونوں کی زندگی میں داخل ہوتا ہے جسے پروفیسر شاہ عالم حد سے زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں اور اس پر اپنی بے انتہا شفقت وعنایت لٹاتے ہیں۔ لیکن ان کی بیگم شبّو بانو اس لڑکے کو قطعی پسند نہیں کرتیں۔ انہوں نے ایک دن پروفیسر صاحب سے کہا-----

''کسی اجنبی کو گھر میں رکھنا اچھی بات نہیں ہے۔''

''وہ اجنبی کہاں ہے، شمع......؟ وہ تو......آپ نے غزالہ بھابی سے فون پر گفتگو کی تھی۔ اُنہوں نے آپ کو بتایا تھا کہ راشد میرے میکے کا پڑوسی ہے۔''

''جو بھی ہو، مجھے اس لڑکے کا یہاں رہنا بالکل پسند نہیں ہے۔''

دھیرے دھیرے شمع بانو کو بھی راشد اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ شمع بانو اُس نوجوان کو بے حد چاہنے لگتی ہیں، اس کو دُنیا کی ہر شئے سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں اور اُس پر اپنا دل و جان نچھاور کرتی ہیں۔

صبح کی نماز کے بعد اکثر شاہ عالم صاحب باغ میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ ایک صبح راشد بھی ان کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ شمع بانو دو پیالی چائے لے کر آ گئیں۔ ٹرے کے اندر ایک طشتری میں گاجر کا حلوہ بھی تھا۔ میٹھا کھانے کے بعد پروفیسر صاحب کو چائے کچھ پھیکی لگی۔ اُنہوں نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا------

''چائے تھوڑی پھیکی ہے۔''

شمع بانو باورچی خانے کے اندر جا کر چینی کا ڈبہ لے آئیں اور آدھی چمچی چینی راشد کی پیالی میں ڈال دیا پھر دھیرے دھیرے چمچی سے چلانا شروع کیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں بالکل نہیں ہیں۔

''یہ کیا؟ چائے میں شکر ڈالنے کے لئے آپ کو میں نے کہا تھا۔ آپ نے تو؟''

ان کی باتیں سن کر شمع بانو بوکھلا گئیں پھر خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگیں----

''ڈائبیٹیز میں لوگ زیادہ شکر کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔''

''لیکن مجھے تو شوگر کی بیماری نہیں ہے۔''

''بیماری نہیں ہوئی تو کیا ہوا؟ آج کے دور میں زیادہ تر لوگ ڈائبیٹیز کے شکار ہو رہے

ہیں۔اس لئے میں نے آپ کو...... میرا مطلب ہے، میں نے پہلے ہی سے شکر کم کر دیا ہے۔شکر کم لیجئے گا تو شوگر کی بیماری آپ سے کوسوں دُور رہے گی۔''

''اچھا بابا! بہت اچھا کیا آپ نے......'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔لیکن فوراً ہی سنجیدگی اختیار کر لی اور سوچنے لگے ''شمع بانو میں یہ تبدیلی کیسی؟ آج کل وہ اتنی بجھی بجھی سی کیوں رہنے لگی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ شمع بانو، راشد پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں؟ پہلے تو وہ اس لڑکے سے بھر مُنہ بات تک نہیں کیا کرتی تھیں، لیکن اب......''

چنانچہ اپنی مسز کی حرکات وسکنات اور دونوں کی بڑھتی ہوئی نزدیکیاں کو دیکھ کر پروفیسر صاحب کی پسند (نوجوان راشد کے سلسلے میں) آہستہ آہستہ نفرت میں بدلنے لگتی ہے۔آگے چل کر میاں بیوی کے باہمی رشتے میں دھیرے دھیرے خلیج پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ نوجوان ان دونوں کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہی ہے کہ عورتوں کے بہ نسبت آدمی زیادہ شکّی مزاج ہوتا ہے۔ اس طرح پروفیسر صاحب شک وشبہات کے حصار میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور نفرت وکدورت کی آگ میں جلنے لگتے ہیں۔جس کے نتیجے میں وہ اپنی پیاری بیگم کو غصّے کے رو میں بہہ کر طلاق دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور طلاق نامہ شمع بانو جو اُن کی منکوحہ ہیں، کو دستخط کرنے کے لئے ان کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں اور دستخط کر اُس نوجوان (راشد) کے ساتھ گھر سے نکل جانے کا فرمان بھی جاری کر دیتے ہیں۔

بہر کیف......! یہ ناولٹ کئی لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ مصنفہ نے جس موضوع کو کہانی کا حصہ بنایا ہے اس میں آخر تک تجسس برقرار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پوری کہانی انجام تک پہنچنے کے لئے بیقرار رہتی ہے اور فکشن کی یہ سب سے اہم خوبی ہے۔ میں کہانی کے بارے میں زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ اس عمل سے کہانی قبل از وقت بے نقاب ہو جائے گی، لیکن ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ موضوع کے اعتبار سے یہ ناولٹ جذبہ و احساس کی گرم جوشی، انفرادیت، کردار کی نفسیات اور انسانی جذبات وکیفیات سے بھرپور ہے۔

مجھے پوری اُمید ہے کہ ادبی حلقے میں ناولٹ ''آپ تو ایسے نہ تھے'' کی ضرور پذیرائی ہوگی اور ڈاکٹر یاسمین اختر کا مذکورہ ناولٹ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ناولٹ ''آپ تو ایسے نہ تھے'' کی کامیاب تخلیق وتصنیف کے لئے میں محترمہ یاسمین اختر کو اپنی دلی مبارکباد دیتا ہوں اور ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو مزید استقلال واستحکام عطا کرے۔ آمین!

افتخار عظیم چاند

۱۸/اگست ۲۰۱۴ء

''احسان ہاؤس'' روڈ نمبر ۶ بی،

راجندر نگر، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۱۶

موبائل نمبر: 9504890054/9631783990

چند باتیں

زندگی بہت حسین ہے اور رنگین بھی۔ زندگی کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگوں کو زندگی کی رنگینی دکھائی نہیں دیتی۔ کچھ لوگ اپنی زندگی سے مایوس، وقت اور حالات کا سامنا کرتے کرتے بالکل تھک جاتے ہیں لہذا وہ برے وقت کو اپنی قسمت کی آزمائش سمجھ کر صبر کر لیتے ہیں۔ ایسا سوچنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ جیسا کہ علامہ محمد اقبالؔ نے کہا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

زندگی سے ہار ماننا بزدلوں کا کام ہے۔ ہمیں ہمت، محنت، عقل اور سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہئے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ زندگی میں جتنے سارے رنگ ہیں ان رنگوں میں سے اپنی پسند کے رنگ کا انتخاب کرنا ہمارا حق ہے۔ اگر زندگی کا کوئی خوش نما رنگ ہاتھ نہیں آتا تو اس کے لئے زندگی کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی ہار مان کر گھر کے کسی کونے میں جیتے جی اپنے آپ کو دفن کر دینا عقل مندی ہے۔ عقل مندی تو اس میں ہے کہ جو رنگ ہمارے ہاتھ میں نہیں آ رہا ہے تو اس رنگ کو یکسر فراموش کر کے دوسرے رنگ کی طرف مائل ہونا چاہئے تا کہ زندگی کو اپنے طریقے سے رنگین بنایا جا سکے۔ میرے حصے میں زندگی کا جو رنگ آیا وہ رنگ کیسے رنگ لائے گا یہ تو میں نہیں جانتی تھی۔ میں بس اتنا ہی جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن یہ رنگ ضرور ہی رنگ لائے گا۔ میری اُمید نے مجھ کو جی توڑ محنت کرنے پر مجبور کیا۔

میری محنت کہاں تک رنگ لائی ہے یہ تو آپ ہی بتائیں گے۔ قارئین حضرات کے نیک مشورے ہی میرا سرمایہ ہیں۔ آپ کی باتوں سے میرے دل کو تقویت پہنچتی ہے۔ میرا حوصلہ بلند ہوتا ہے اور دل میں کچھ اور کہنے کی تمنا جاگ اُٹھتی ہے۔ لہذا قارئین کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی اپنی قیمتی رائے سے مطلع فرمائیں۔ اس کے لئے میں حد درجہ آپ کی ممنون و مشکور رہوں گی۔

شکریہ کے ساتھ......!

ڈاکٹر یاسمین اختر

موبائل نمبر: 8409644282

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب پروفیسر شاہ عالم نے راشد کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ ساون کا مہینہ تھا۔ آٹھ دنوں سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ کبھی نہ ختم ہونے والی بارش۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دوسرا کوئی موسم پلٹ کر آئے گا ہی نہیں۔ بلا کی آندھی چل رہی تھی۔ آندھی میں پتے اور شاخیں ہی پیڑ سے الگ نہیں ہوئی تھیں بلکہ کئی پیڑ بھی گر گئے تھے۔ جگہ جگہ پانی جمع ہو گیا تھا۔ پیڑ کے پتے اور ٹہنیاں بارش کے پانی میں تیر رہی تھیں۔ تیز ہوا کے جھونکوں نے بجلی کے کھمبے تک کو گرا دیا تھا۔ آس پاس کے علاقے کے ساتھ ساتھ ان کی حویلی بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پروفیسر شاہ عالم عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے بستر پر دراز تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' وہ بستر سے نیچے اُتر کر دروازہ کی طرف بڑھے۔ ان کے سامنے ۲۳۔۲۴ سال کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے کاندھے پر ایک بیگ لٹک رہا تھا۔ اور ہاتھ میں ایک سوٹ کیس بھی تھا۔

''کس سے ملنا ہے، تمہیں؟'' پروفیسر صاحب نے دریافت کیا۔

''جی ...... جی، شمع آنٹی یہاں ہی رہتی ہیں؟'' لڑکے نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

ہاں ...... ! مگر تم ......؟''

''کون ہے؟''

''پتہ نہیں...... آپ سے کوئی ملنے کے لئے آیا ہے۔''

''مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہے؟'' اُنہوں نے دروازہ کے قریب آ کر حیرت سے پوچھا اور اس لڑکے کو اچنبھے پن سے دیکھا، پھر بولیں-----

''کون ہو، تم......؟''

''جی میرا نام راشد ہے۔'' نوجوان نے کہا۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' اس سے پہلے کہ وہ اُن کے سوالوں کا جواب دیتا پروفیسر شاہ عالم نے خط ان کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ لیجئے...... یہ لڑکا آپ کے نام ایک خط بھی لایا ہے۔''

اُنہوں نے خط کو لفافے سے نکال کر سرسری طور پر دیکھا۔ اور پھر پڑھنے لگیں۔

میں غزالہ تمہاری بھابی......!

ایک لڑکا تمہارے یہاں بھیج رہی ہوں۔ بہت ہی شریف لڑکا ہے اور خوش مزاج بھی ہے۔ اسٹیٹ بینک میں اس کی نئی نئی سروس ہوئی ہے۔ پردیسی ہے، بیچارہ...... رہنے کو تو ہمارے گھر میں بھی رہ سکتا ہے، لیکن اس کا دفتر تمہارے گھر کے آس پاس ہی ہے۔ اس لئے میں نے وہاں بھیج دیا۔ کوئی تکلف مت کرنا، اس کو رہنے کے لئے ایک کمرہ چاہئے۔ باقی سارا انتظام وہ خود ہی کر لے گا۔ خدا حافظ۔

شمع بانو نے اس خط کو پروفیسر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ پھر ان کے کان میں سرگوشی کرنے لگیں۔

''یہ غزالہ بھابی بھی عجب ہیں۔ ہمیشہ ہی مجھے کسی نہ کسی اُلجھن میں ڈال دیتی ہیں۔ کسی

اجنبی کو اپنے گھر میں رکھنا...... وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوگئیں پھر کہنے لگیں------

''اِس وقت فون بھی کام نہیں کر رہا ہے۔ ورنہ بھابی سے اس بارے میں بات کر لیتی۔''

''بات چیت تو بعد میں ہوتی رہے گی۔ فی الحال میں اِس کو گیسٹ روم میں رہنے کی اجازت دے دیتا ہوں۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' شمع بانو نے لا پروائی سے کہا اور پروفیسر صاحب اس لڑکے کو ساتھ لے کر گیسٹ روم کی طرف بڑھے۔

صبح بارش بالکل تھم چکی تھی۔ بادل بھی قریب قریب چھٹ چکے تھے۔ دھوپ کی ہلکی سی کرن جیوں ہی نظر آئی لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل پڑے۔ پروفیسر شاہ عالم بھی اپنے کمرے سے نکل کر باغیچے کی جانب بڑھے۔ وہ کیا دیکھتے ہیں کہ راشد ان پودوں میں الجھا ہوا ہے جو بارش کی یورش سے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ وہ کسی تجربہ کار مالی کی طرح پھولوں اور پتیوں کو سمیٹ رہا تھا۔ اس کے سفید کرتہ اور پائجامہ میں کئی جگہ پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔

''یہ...... یہ...... تم کیا کر رہے ہو، راشد؟'' پروفیسر شاہ عالم نے والہانہ پن سے پوچھا۔

''کچھ نہیں، انکل...... بس یونہی، میں جب اپنے کمرے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ باغیچے کے چھوٹے چھوٹے پودے بے ترتیب ہو رہے ہیں۔''

''لیکن تم...... تم تو اِس گھر کے مہمان ہو۔''

''تو کیا ہوا انکل......! انسان کو کام سے لگاؤ ہونا چاہئے۔ مہمان کے ہاتھ پاؤں تو بندھے نہیں ہوتے ہیں۔ ویسے بھی مجھے پیڑ پودوں سے بہت لگاؤ ہے۔ میں نے صاف صفائی کر دی ہے، اب آپ کو ہاتھ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔ آج میرا دفتر میں پہلا دن ہے۔ سوچ رہا تھا کہ وقت سے پہلے نکل جاؤں۔''

''اکیلے جاؤ گے، تم؟''

''جی......انکل۔''

''اور......ناشتہ؟''

''ناشتہ کسی ریسٹورینٹ میں کرلوں گا......!''

ہرگز نہیں......تمہارا دفتر میرے کالج والے راستے میں پڑتا ہے۔ چلو...... پہلے چل کر ناشتہ کرتے ہیں، پھر میں تم کو اپنی گاڑی سے چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں انکل......آپ زحمت نہیں کریں، میں خود چلا جاؤں گا۔''

''ایسے کیسے چلے جاؤ گے۔ اسٹیٹ بینک میں میرا ایک دوست بھی کام کرتا ہے، پہلے میں ان سے تمہاری جان پہچان کرادوں، پھر جیسے من چاہے آنا جانا کرنا۔'' اُنہوں نے تحکمانہ لہجے میں کچھ اس طرح کہا کہ راشد خاموش ہو گیا۔

وہ ایک فیملی ممبر کی طرح وہاں رہنے لگا تھا۔ چھوٹے بڑے ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ جو کام پروفیسر صاحب کے ذمہ ہوتا ان کے کرنے سے پہلے ہی راشد کردیا کرتا تھا۔ شمع بانو کو اس لڑکے کا یہاں رہنا اور گھر کے کام کاج میں حصہ لینا بالکل پسند نہیں تھا۔ اُنہوں نے ایک دن پروفیسر صاحب سے کہا------

''کسی اجنبی کو گھر میں رکھنا اچھی بات نہیں ہے۔''

''وہ اجنبی کہاں ہے، شمع......؟'' وہ تو......آپ نے غزالہ بھابی سے فون پہ گفتگو کی تھی۔ اُنہوں نے آپ کو بتایا تھا کہ راشد میرے میکے کا پڑوسی ہے۔''

''جو بھی ہو، مجھے اس لڑکے کا یہاں رہنا بالکل پسند نہیں ہے؟''

''اتنی بڑی حویلی میں ہم صرف دو افراد ہی رہتے ہیں۔ افسانہ جھاڑو پوچھا کرنے آتی ہے اور وہ بھی چلی جاتی ہے۔ پوری حویلی خالی خالی...... جب سے یہ آیا ہے گھر میں رونق آگئی ہے۔ جب تک گھر میں ہوتا ہے، وہ ہنستا ہنساتا ہی رہتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر یہ ہمارے ساتھ

رہ رہا ہے تو کیا دقت ہے؟''

''آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے، زمانہ بہت خراب ہے۔ آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے، کہیں کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔'' شمع بانو نے پروفیسر صاحب کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ایک ماہ سے وہ ہمارے ساتھ رہ رہا ہے۔ آپ کو اس لڑکے میں کیا خرابی نظر آتی ہے۔ کوئی چھل کپٹ، کوئی فریب......؟'' شاہ عالم نے شمع بانو سے پوچھا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' شمع بانو نے کہا۔

''تو پھر رہنے دیجئے، اس کو۔ آپ تو خواہ مخواہ چھوٹی چھوٹی بات کو لے کر پریشان ہو جاتی ہیں۔'' پروفیسر صاحب بولے۔

''نہیں، میں سوچ رہی تھی کہ......''

''پلیز چھوڑیئے ان باتوں کو......'' اُنہوں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کچھ اس طرح کہا کہ وہ خاموش ہو گئیں۔

ایک رات پروفیسر شاہ عالم کی نیند ٹوٹ گئی۔ بڑی خاموش رات تھی۔ یہی قریب ڈیڑھ دو بج رہے ہوں گے۔ میز پر ایک جگہ پانی اور گلاس رکھا تھا۔ اُنہوں نے ہاتھ بڑھا کر گلاس میں پانی اُنڈیلنا چاہا، لیکن ہاتھ نہیں اُٹھ سکا۔ جسم کے ہر اعضا میں شدید درد کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ...... یہ کیا؟ میرے تو ہاتھ پاؤں ہی کام نہیں کر رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کہ پورا جسم معذور ہو گیا ہے۔ کہیں میں فالج کا شکار تو نہیں ہو گیا ہوں؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں کسی کام کا نہیں رہوں گا۔ وہ پورے جسم سے کانپ گئے۔ گھبراہٹ میں ان کی زبان سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے غمناک آواز میں بولے------

''شمع اُٹھئے......، دیکھئے مجھے کیا ہو گیا ہے؟''

''کیا ہوا آپ کو؟'' شمع بانو نے پوچھا۔

"پتہ نہیں میرے ہاتھ پاؤں کام نہیں کر رہے ہیں ۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے ...... وہ آگے کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔ ضبط کرنے کی تاب بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ زور زور سے چیخ اُٹھیں گے۔ شمع بانو نے کمرے سے باہر نکل کر راشد کو آواز دی۔ وہ نیند میں تھا۔ ان کی آواز سنتے ہی بستر سے نیچے اُتر کر باہر چلا آیا اور پھر پروفیسر صاحب کو بچوں کی طرح پلنگ کی پشت کے سہارے بٹھا دیا۔ اس کے بعد کئی ڈاکٹروں کا نمبر ڈائل کیا پر کسی نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ اپنی موٹر سائیکل نکال کر آس پاس میں رہنے والے ڈاکٹروں کے گھر بھی گیا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کرے تو کیا کرے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پوری رات ان کے پاس بیٹھ کر ہی گزار دیا۔ صبح جیسے ہی سورج نے اپنا پنکھ پھیلایا اس نے گاڑی نکالی اور دو آدمیوں کے سہارے ان کو گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر ونود کے نرسنگ ہوم میں لے گیا۔ ڈاکٹر ونود نے کچھ دیر تک ان کا معائنہ کیا اور نسخے پر کئی طرح کے ٹسٹ لکھ دیئے۔ راشد نے جانچ وغیرہ کرانے میں ان کی بڑی مدد کی۔ شمع بانو کے لئے یہ سب کرنا ممکن نہیں تھا، چنانچہ میڈیکل رپورٹ سے پتہ چلا کہ پروفیسر شاہ عالم صاحب لقوہ کے مریض نہیں ہیں بلکہ آج کی فضاؤں میں جوڑوں کے درد کی ایک نئی بیماری ہے جو سارے شہر میں میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جاننے کے بعد انہیں ڈھارس ہوئی۔ شمع بانو نے بھی اپنے آپ میں تھوڑا اطمینان وسکون محسوس کیا۔ لیکن پھر بھی وہ بہت پریشان تھیں۔ ایک اکیلی عورت کرے تو کیا کرے؟ راشد کا ساتھ نہیں ہوتا تو پتہ نہیں ان کا کیا حال ہوتا؟ راشد نے جس طرح ان کی خدمت کی کوئی اپنا بھی ہوتا تو اتنی زیادہ تیمارداری اور خدمت نہیں کرتا۔ الغرض راشد کی خدمت گاری اور شمع بانو کی دعاؤں کا اثر تھا کہ پروفیسر صاحب دوبارہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

راشد اب پوری طرح ان کے گھر کا ایک فیملی ممبر بن چکا تھا۔ اس کی اجنبیت کافی حد تک دُور ہو چکی تھی۔ شمع بانو کو بھی اب اس سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اپنائیت سے پیش آنے لگی تھیں۔ لیکن اتنا بھی اپنا پن ٹھیک نہیں ۔ پہلے پہل ان کی ناراضگی پروفیسر

صاحب کو کھٹکتی تھی، لیکن اب ان کا اپنا پن انہیں نا گوار لگنے لگا تھا۔

صبح کی نماز کے بعد پروفیسر شاہ عالم اکثر باغ میں بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتے تھے۔ایک صبح راشد بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔شمع بانو دو پیالی چائے لے کر آ گئیں۔ٹرے میں ایک طشتری گاجر کا حلوہ بھی تھا۔میٹھا کھانے کے بعد پروفیسر صاحب کو چائے پھیکی لگی۔اُنہوں نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا------

''چائے تھوڑی پھیکی ہے۔''

شمع بانو باورچی خانہ میں جا کر چینی کا ڈبہ لے آئیں اور آدھی چمچی چینی راشد کی پیالی میں ڈال دیا۔ پھر دھیرے دھیرے چمچی سے چلانا شروع کیا۔ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہیں۔

''یہ کیا؟ چائے میں شکر ڈالنے کے لئے میں نے کہا تھا، پر آپ نے تو؟''

ان کی باتیں سن کر شمع بانو بوکھلا گئیں، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگیں-----

''ڈائبیٹیز میں لوگ زیادہ شکر کا استعمال نہیں کرتے۔''

''لیکن مجھے تو شوگر کی بیماری نہیں ہے۔''

''نہیں ہے تو کیا ہوا؟ آج کے دَور میں زیادہ تر لوگ ڈائبیٹیز کے شکار ہو رہے ہیں۔اس لئے میں نے آپ کو...... میرا مطلب ہے، میں نے پہلے ہی سے شکر کم کر دیا ہے۔شکر کا استعمال کم کیجئے گا تو شوگر کی بیماری آپ سے کوسوں دُور رہے گی۔''

''اچھا بابا! بہت اچھا کیا، آپ نے ......'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔لیکن فوراً ہی سنجیدگی اختیار کر لی۔اور سوچنے لگے...... ''شمع بانو میں یہ تبدیلی کیسی؟ وہ آج کل اتنی بجھی بجھی سی کیوں رہنے لگی ہے؟ کیوں ایسا لگتا ہے کہ شمع بانو، راشد پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں؟ پہلے تو وہ اس لڑکے سے بھر مُنہ بات تک نہیں کیا کرتی تھیں، لیکن اب ...... آخر بات کیا ہے؟ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

میں تو بیکار ہی ان پر شک کر رہا ہوں۔ میں نے ہی تو شمع سے کہا تھا کہ پردیسی ہے بیچارہ...... اور ہمارا مہمان بھی...... کچھ دنوں تک ہمارے ساتھ رہے گا پھر اپنا ڈیرا کہیں اور لے لیگا۔ میں تو معمولی سی بات کو لے کر......"

"کیا ہوا؟ کیا سوچ رہے ہیں، آپ؟" شمع بانو نے ان کا دھیان اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کچھ نہیں...... میں...... میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ اکیلی گھر کا کام کاج کرتے کرتے تھک جاتی ہیں۔ اگر افسانہ گھر کے کام کاج میں سارا دن آپ کا ہاتھ بٹانے کے لئے راضی ہو جائے تو......"

"راشد ہے نا میرا ہاتھ بٹانے کے لئے......" شمع بانو کہنے لگیں۔

"راشد کی بات الگ ہے، لیکن افسانہ......"

"افسانہ اس ماہ کے بعد کام پر نہیں آئے گی۔ آپ بیکار ہی اس کی آس لگا رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے، کل ہی اس کی ماں سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ "میں افسانہ کے لئے لڑکا ڈھونڈ رہی ہوں۔ اب وہ کسی کے گھر کام نہیں کرے گی۔"

"کل تو افسانہ کی ماں سے میری بھی ملاقات ہوئی تھی۔" پروفیسر صاحب نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ "میم صاحب نہیں چاہتیں کہ افسانہ اب آپ کے گھر میں کام کرے۔ انہوں نے افسانہ کو اگلے ماہ سے آنے کے لئے منع بھی کر دیا ہے۔ پھر شمع ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟ پتہ نہیں کیا ماجرا ہے؟ شمع جھوٹ بول رہی ہیں یا افسانہ کی ماں میری سمجھ سے باہر ہے۔ لیکن شمع مجھ سے جھوٹ کیوں بولیں گی۔ آخر کیا وجہ ہے؟ بار بار مجھے اس بات کا احساس کیوں ہوتا ہے کہ شمع اب پہلے والی شمع نہیں رہیں۔ ان میں کافی بدلاؤ آ گیا ہے۔ پتہ نہیں یہ میرا وہم ہے یا پھر......" انہوں نے لاپرواہ ہو کر منہ بنایا۔

شمع بانو ان کی طرف دیکھے بغیر ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے راشد کو بھی اشارے

سے اُٹھنے کے لئے کہا پھر پروفیسر صاحب کی طرف منہ بنا کر بولیں-----

''بتایئے...... میں آپ کے لئے ناشتے میں کیا بناؤں؟''

''جو جی میں آئے، بنا لیجئے......!'' اُنہوں نے مختصر سا جواب دیا۔ ان کے لہجے میں خشکی شامل تھی۔

سردی کا موسم تھا۔ صبح ہی سے چاروں طرف کہرا چھایا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک اولا گرتا رہا اُس کے بعد آسمان صاف ہو گیا۔ لیکن دُھوپ کا کہیں کوئی آثار نظر نہیں آ رہا تھا۔ صبح ہی سے پروفیسر شاہ عالم کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ سردی کے ساتھ ساتھ ہلکا سا بخار بھی تھا۔ بدن، ہاتھ میں درد، سر میں چکر...... دل میں عجیب سی بے چینی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی قیمتی چیز ہاتھ سے نکل رہی ہو۔ وہ اس کی حفاظت کرنا چاہتے تھے، مگر کیسے......؟ شائد یہی وجہ تھی کہ ان کا ڈیوٹی پر جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ کالج چلے گئے۔ کلاس روم کی کھڑکی کھلی تھی۔ بجلی نہیں تھی اس لئے انہوں نے کھڑکی کو بند کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے سرد ہوا اندر آ رہی تھی۔ پروفیسر صاحب کو شدید ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ بڑی مشکل سے دو کلاسیز لیا اور ایچ.او.ڈی. کے کیبن میں آ کر معذرت چاہی اور پھر اپنے گھر کا رُخ کیا۔ ہال میں پلنگ بچھا تھا۔ شمع بانو اور راشد ایک ہی بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی ہنسی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے دونوں اپنی مستی میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ یہ ہنسی ان کے کانوں کو ذرا بھی نہیں بھائی۔ وہ اپنے کانوں میں اُنگلی ڈال کر ایسا کھڑے ہو گئے جیسے اسکول کے بچے ٹفن کی گھنٹیوں کی آواز سن کر اُنگلی ڈال لیتے ہیں۔ پھر وہ کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ پروفیسر صاحب کو دیکھ کر شمع بانو چونک اُٹھیں۔

''آج...... آج آپ بڑی جلدی آ گئے؟'' پروفیسر صاحب نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''یہ راشد کا بچہ...... ایک سے بڑھ کر ایک لطیفہ سنا رہا ہے۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ لطیفے کے

فن میں یہ اس قدر ماہر ہے۔ میں تو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔آپ سنیں گے تو آپ بھی ہنسیں گے۔'' اُنہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم...... دفتر نہیں گئے؟'' وہ راشد کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں ...... انکل! میں دفتر گیا تھا، اچانک ہی پیٹ میں درد ہوگیا۔ اس لئے واپس چلا آیا۔''

''پیٹ میں اس کو درد ہوتا ہے جو کاہل ہوتے ہیں اور کام سے بچنے کی خاطر پیٹ کے درد کا بہانہ بناتے ہیں۔ پر تم تو......؟ خیر......'' اُنہوں نے شمع بانو کی طرف رُخ کیا۔

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے، سردی نے جکڑ رکھا ہے، فیور بھی ہے۔ ہو سکے تو ایک پیالی ادرک والی چائے بنا دیجئے......!''

''آنٹی......! آپ انکل کے پاس ہی بیٹھئے۔ میں ادرک والی چائے بہت اچھی بناتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ باورچی خانہ کی طرف بڑھ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد دو پیالی ادرک والی چائے لے کر حاضر ہوا۔

''لیجئے...... انکل!'' راشد نے سعادت مندانہ آواز میں کہا۔

''سونے دیجئے ...... مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اُنہوں نے کروٹ بدلی اور شمع بانو کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''دروازہ بند کر دیجئے......!''

چائے سے گرم گرم بھاپ نکل رہا تھا۔ راشد نے ایک نظر چائے کے پیالے پر ڈالی اور شمع بانو کی جانب جھک کر کہا...... ''اگر انکل میرے ہاتھ کی بنی ہوئی ادرک والی چائے پی لیں گے تو سردی دُور چلی جائے گی اور سر کا درد بھی غائب ہو جائے گا۔''

شمع بانو نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ یونہی خاموش بیٹھی رہیں۔ راشد کو بھی پروفیسر صاحب سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ چند سکنڈ وہیں کھڑا رہا پھر چائے کی پیالی لے کر باہر

نکل گیا۔ دروازے کے دونوں پٹ برابر سے نہیں لگے ہوئے تھے۔ ہوا کا تیز جھونکا انہیں ڈھکیل کر کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پروفیسر صاحب نے کنکھیوں سے دروازہ کی طرف دیکھا اور کہا----

''دروازے کے دونوں پٹ بھی کھول دیجئے۔''

''باہر برفیلی ہوا چل رہی ہے۔'' شمع بانو بولیں۔ ''آپ کو نقصان پہنچائے گی......!''

''دروازہ اگر پوری طرح کھول دیا جائے تو سرد ہوا کا احساس نہیں ہوگا، لیکن دروازے کے پٹ کو ڈھکیل کر جو ہوا اندر آ رہی ہے اس سے مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ دونوں پٹ کھول دیجئے یا پھر دروازہ ہی بند کر کے چٹخنی چڑھا دیجئے۔''

شمع بانو نے حیرت زدہ ہو کر اُن کی طرف دیکھا۔ چہرے سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ان کی باتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ جیسے ہی پروفیسر شاہ عالم کو احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود نہیں ہے وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ آج وہ بہت زیادہ اُداس تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اپنے آپ سے ہی ناراض ہوں۔ جینے کے لئے صرف عیش و آرام نہیں چاہئے بلکہ ہنسنا بولنا بھی ضروری ہے، اور انسان خود سے باتیں نہیں کیا کرتا۔ شمع کے اندر جو تبدیلی میں دیکھ رہا ہوں وہ شائد میری ہی لاپروائی کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی ڈیوٹی اور شعر و شاعری کے علاوہ کبھی کسی چیز کو اہمیت نہیں دی۔ مجھے شور بالکل نہیں بھاتا اور شمع تو تنہائی پسند نہیں۔ شمع بیچاری اکیلی جان ہر وقت گھٹتی رہتی ہے۔ کتنی بار اُس نے مجھ سے کہا کہ ''چلئے آج غزالہ بھابی کے یہاں چلتے ہیں۔'' میں نے منع کر دیا۔ ''آج آپ کو چھٹی ہے، کیوں نہ ہم اِدھر اُدھر کہیں گھومنے کے لئے چلیں۔'' لیکن میں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس بار عید کے موقعے پر اس نے بہت ضد کی کہ ''بازار جا کر آپ کی پسند کا کپڑا خرید لائیں۔'' میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ یہ میری ہی کمزوری تھی جو وہ کسی اور کے ساتھ گھل مل گئی۔ کئی دنوں تک وہ ان سب باتوں کو لے کر کافی پریشان رہے، پھر ایک دن صبح صادق شمع بانو کے پاس آئے۔ اس وقت شمع بانو ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ ان پر نظر پڑتے ہی پوچھنے لگیں------ ''کچھ چاہئے، کیا؟''

''نہیں ...... '' پروفیسر صاحب نے نفی میں جواب دیا۔

''شائد آپ ناشتے کے بارے میں پوچھنے آئے ہیں۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ...... وہ کیا ہے کہ......'' وہ ذرا دیر کے لئے ٹھٹھک گئے، پھر بولے------''آج کلاس سسپنڈ ہے۔''

''پھر تو آپ سارا دن گھر پر ہی رہیں گے۔؟''

''نہیں ...... میں سوچ رہا ہوں کہ اگلے ہفتہ ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ ہر سال آپ سالگرہ منانے کی ضد کرتی ہیں، لیکن میں ...... میں آپ کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ اس بار کیوں نہ ہم اس موقع پر ایک پارٹی دے دیں۔'' شمع بانو نے اچنبھے پن سے ان کی طرف دیکھا۔ ایسا لگا جیسے اُنہوں نے ایسا کچھ کہہ دیا ہو جو ممکن نہیں ہو۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں، آپ؟ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ ہر سال آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ ہم شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے منائیں اور میں منع کر دیتا تھا۔ کہیں کوئی پروگرام ہو یا پھر شادی بیاہ میں جانے کی بات ہو، میں ہمیشہ انکار کر جاتا ہوں اور میری وجہ سے آپ بھی کہیں آنا جانا نہیں کرتیں، میرے بغیر کہیں جاتی بھی ہیں تو چہرے پر وہ خوشی نہیں ہوتی جو میرے ساتھ جانے میں ہوتی ہے۔ کاش کہ مجھے پہلے اِس بات کا احساس ہوا ہوتا۔ مدتوں بعد مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے آپ کی خوشیوں کا گلا دبوچ لیا ہے اور میرا حق نہیں بنتا ہے کہ......''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' شمع بانو نے ان کی باتیں پوری ہونے سے پہلے ہی بیچ میں کہا۔

''بات کچھ ہو یا نہیں ہو، لیکن میں نے پروگرام بنایا ہے کہ اس بار ہم اپنی شادی کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائیں گے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟'' شمع بانو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب وہ بات نہیں رہی جیسا کہ آپ سوچ رہے ہیں۔ اِس عمر میں ہم شادی کی سالگرہ منائیں گے تو لوگ کیا کہیں گے؟''

''کوئی کچھ نہیں کہے گا...... آپ یونہی خوف کھا رہی ہیں۔ دعوت میں لوگ شریک ہوں گے، کھائیں گے، پئیں گے، پارٹی کا لطف اُٹھائیں گے اور چلے جائیں گے۔''

''ارے نہیں، پارٹی وارٹی کیا دیجئے گا...... ہم تین لوگ ہیں نہ جشن منانے کے لئے۔ ہو سکے تو غزالہ بھابی کو بھی بلوا لیں گے۔'' شمع بانو نے کہا۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ بہتر سمجھیں۔'' پروفیسر صاحب نے ہلکے سے مسکرا دیا، پھر بول پڑے

''تو پھر چلیں؟''

''کہاں؟''

''بازار سے کپڑے گہنے سب خرید لاتے ہیں۔''

''آج......؟'' شمع بانو نے پوچھا۔ ان کی آواز میں بوکھلاہٹ تھی۔

''ہاں! آج ہی......''

''نہیں، آج نہیں...... آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' شمع بانو کہنے لگیں۔

''کیا ہوا، آپ کی طبیعت کو؟'' پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس یونہی پاؤں میں تھوڑا درد ہے۔''

''چلیئے، ڈاکٹر کو دکھا آتے ہیں۔''

''نہیں اتنی سی بات کے لئے ڈاکٹر کے پاس کیا جائیں۔ درد کی دوا ہے نہ میرے پاس، ناشتے کے بعد لے لوں گی۔''

''تو پھر جلدی سے ناشتہ دیجئے، میں کالج چلتا ہوں۔''

''آپ نے تو کہا تھا کہ کالج بند ہے۔''

''ہاں! کالج بند ہی ہے، لیکن دفتر کھلا ہے، میں وہیں جا کر اپنا کام نپٹا لوں گا۔''

''کب تک واپس لوٹئے گا؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں۔ ڈھائی تین تو بج ہی جائیں گے۔''

''وہ دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اسی درمیان راشد کی آواز کانوں میں گونجی...... ''لائیے آنٹی، میں ناشتہ لگا دیتا ہوں۔''

''نہیں، تم فریج سے پانی کا بوتل نکال دو، ناشتہ میں لگا لوں گی۔''

راشد کی آواز سن کر پروفیسر صاحب کے پورے جسم میں خون دوڑ گیا۔ اُنہوں نے گردن موڑ کر ایک نفرت بھری نگاہ اُن دونوں پر ڈالی اور باہر نکل گئے۔

بارہ بجنے کو تھے۔ کالج کے دفتر میں کوئی خاص بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ دفتر میں کام کرنے والے کچھ لوگ ہی کام کر رہے تھے اور کچھ چھٹی میں تھے۔ پروفیسر شاہ عالم بمشکل ایک گھنٹہ ہی وہاں ٹھہرے ہوں گے۔ وہ اپنی فائل ایک کلرک کے حوالے کر دفتر سے باہر نکل گئے۔ گھر پہنچنے پر وہ کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں تالا لگا ہوا تھا۔

''کہاں گئی ہوگی شمع...... ؟ وہ تو کہہ رہی تھی کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اور راشد کا دفتر بھی آج بند ہے۔ کہیں وہ دونوں ایک ساتھ تو نہیں گئے ہیں؟ پتہ نہیں وہ دونوں ساتھ ہی گئے ہیں یا اکیلے، میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' اُنہوں نے اپنی جیب سے دوسری چابی نکالا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ سامنے والا پڑوسی اپنے بالکونی سے جھانکتا ہوا شوخ لہجے میں بولا۔

''آج کل آپ کے گھر میں ایک جوان لڑکے کو دیکھتا ہوں؟''

''ہاں......!''

''کون ہے وہ؟'' اس نے پروفیسر صاحب سے پوچھا۔

''وہ ہمارا پیئنگ گیسٹ ہے۔'' پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔

''اتنی بڑی حویلی میں پیئنگ گیسٹ...... ؟ وہ بھی ایک جوان لڑکا......؟'' اس آدمی نے ایک زوردار ٹھہا کا لگایا۔ پھر کہنے لگا...... ''بڑا ہی خوبصورت اور جوشیلا جوان ہے، وہ۔ ارے ہاں! ایک بات تو میں کہنا ہی بھول گیا۔ پتھر پتھر ہی ہوتا ہے، ہیرا ہو یا کوئلہ۔ شیشے کے گھر میں پتھر رکھوگے تو گھر کے ٹوٹنے کا خطرہ بنا رہتا ہے۔''

پروفیسر شاہ عالم غصے سے لال پیلے ہوگئے۔ ان کے دل و دماغ میں عجیب سی بے چینی شامل تھی۔

''آخر یہ شمع گئی تو کہاں گئی؟ موبائل فون بھی گھر پر ہی چھوڑ کر گئی ہے۔ راشد کو فون لگاتا ہوں تو وہ بھی نہیں اُٹھاتا ہے۔'' پریشان حال اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔ پھر اپنے کمرے کا رُخ کیا، لیکن کمرے میں داخل ہونے کے بجائے وہ راشد کے کمرے کی طرف بڑھے۔ اس کے کمرے میں بھی تالا لگا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آگئے اور شمع بانو کی آلماری کھول کر اس کی تلاشی لینی شروع کی۔ کپڑوں کے بیچوں بیچ دو بڑے سائز کی تصویریں تھیں۔ ایک تصور میں راشد تھا اور دوسری تصویر میں راشد بھی تھا اور شمع بانو بھی...... یہ اُنہیں کے باغ کی تصویریں تھیں۔ اُنہوں نے اپنے خیالوں میں کئی تصویریں بنائیں اور آپے سے باہر ہوگئے۔ لیکن پھر خود کو سنبھالتے ہوئے سوچنے لگے...... ''اِن تصویروں سے کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ شمع سے اس کے متعلق بات کروں۔ لیکن میں اس سے کہوں گا، کیا؟'' وہ کچھ دیر تک سوچ و فکر میں مبتلا رہے پھر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ اپنا ہی بستر انہیں کانٹوں کی مانند چبھتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں بستر کو نہارنا شروع کیا۔ سب کچھ تو ویسا ہی تھا، جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ لیکن انہیں پھر بھی سکون نہیں مل پا رہا تھا۔ وہ بستر سے اُٹھ کر ہال میں چلے آئے اور کہنیوں پر سر رکھ کر ایسا لیٹ گئے جیسے کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کی آنکھ لگ گئی اور جب آنکھیں کھلیں تو شمع بانو کی آواز سننے کو ملی۔

''آپ کب آئے؟''

اُنہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا، تین بجنے والے تھے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ سامنے ہی شمع بانو کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ تھا۔ اور دوسرا پیکٹ راشد کے ہاتھ میں تھا۔

''میں تو بہت پہلے ہی آ گیا تھا، لیکن آپ......؟ آپ کہاں گئی تھیں؟''

''میں بازار گئی تھی۔''

''آپ نے تو کہا تھا کہ میرے پیروں میں درد ہے......؟''

''درد تو تھا پر اب زیادہ درد نہیں ہے، دوا لیا تو کافی راحت ملی۔''

''آپ کو تو آرام کرنا چاہئے تھا......''

میں تو آرام ہی کر رہی تھی، لیکن راشد۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ راشد کتنا ضدی ہے، جو کہتا ہے وہ کر کے چھوڑتا ہے۔ خیر...... جانے دیجئے ان باتوں کو...... یہ دیکھئے...... میں آپ کے لئے کیا لائی ہوں؟''

''میرے لئے یا راشد کے لئے......؟''

ان کے اس سوال پر راشد نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکالیں، لیکن شمع بانو پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ فوراً ہی بولیں......

''نہیں یہ سوٹ کے کپڑے، آفس بیگ، ٹیبل لیمپ، قلم اسٹینڈ، سب آپ کے لئے ہیں۔''

''راشد تو بس یونہی مجھ کو لسّی پلانے کے لئے لے گیا تھا۔''

''ڈاکٹر نے آپ کو دہی کھانے سے منع کیا ہے، پھر بھی آپ لسّی پینے چلی گئیں۔''

''کہا نہ راشد نے ضد کی اور میں اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی۔''

''جانے سے پہلے ایک فون تو کر دیا ہوتا۔''

''معاف کیجئے گا، جلدی جلدی میں، میں اپنا موبائل یہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔''

''کس بات کی جلدی تھی، آپ کو؟''

''مجھے نہیں...... راشد کو جانے کی جلدی تھی۔ میں نے تو بہت منع بھی کیا، لیکن راشد...... آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ کتنا ضدی ہے۔ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے۔''

''کیوں راشد؟ تم بھی تو فون کر سکتے تھے۔'' اُنہوں نے شکایت آمیز نظروں سے راشد کی جانب دیکھا۔

''نہیں انکل! وہ...... وہ کیا ہے کہ......'' راشد کی زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔

''اب چھوڑیئے بھی ان باتوں کو......'' شمع بانو نے ہلکے سے سر کو جنبش دی۔ ''آج بیچارے کا جنم دن ہے، آپ بھی کیا سوال و جواب لے کر بیٹھ گئے۔''

''آج تمہارا جنم دن ہے؟ بڑی مشکل سے پروفیسر صاحب نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ صبح جب میں نے تم سے کہا کہ ''سال لگنے کو ہے، اتنی دُور سے تم یہاں سروس کرنے کے لئے آئے ہو، تم نے ایک بار بھی اپنے گھر جانے کے بارے میں نہیں سوچا، دو چار دنوں کے لئے ہی سہی، چھٹیوں میں تم کو گھر جانا چاہئے۔ صرف جی انکل کہہ کر رہ گئے۔ تم نے یہ نہیں بتایا کہ آج تمہارا جنم دن ہے۔''

''اسے بھی کہاں یاد تھا...... وہ تو میں نے بتایا کہ آج تمہارا جنم دن ہے۔'' شمع بانو نے کہا۔

''آپ نے بتایا......؟ پر آپ کو کیسے معلوم ہوا......؟'' پروفیسر صاحب پوچھنے لگے۔

''وہ کیا ہے کہ پرسوں میں اس کے کمرے میں گئی تھی تو میری نظر ٹیبل پر رکھے ہوئے

آئی کارڈ پر گئی جس میں اس کا برتھ ڈے لکھا تھا۔"

"او...... ہو" اُنہوں نے ہلکے سے اپنی گردن ہلائی اور طنزیہ انداز میں بولے......

"راشد کو گفٹ میں کچھ دے رہی ہیں یا نہیں؟"

"دے رہی ہوں نا، یہ چشمہ......" وہ کالی فریم والا چشمہ راشد کی ناک پر چڑھا کر مسکرائیں اور کہنے لگیں...... "یہ دیکھئے...... اس کو کتنا سوٹ کر رہا ہے۔ یہ میں نے آپ کی طرف سے لیا ہے اور یہ سوٹ کے کپڑے میری طرف سے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہاں راشد کا اپنا تو کوئی ہے نہیں، اس لئے میں ہی اس کو برتھ ڈے پارٹی دے دیتی ہوں۔" اور اتنا سب کچھ کہہ کر وہ کافی مغموم ہو گئیں۔

"غزالہ بھابی ہیں، نا...... مائیکے کی پڑوسن۔"

"ارے ہاں......! مجھے اُن کا ذرا بھی خیال نہیں رہا۔ اتنے دنوں کے بعد گھر سے باہر نکلی بھی پر بھابی سے مل کر نہیں آئی۔ وہاں جاتی اور ان کو رات کے کھانے کی دعوت ہی دے دیتی۔"

"ابھی بھی وقت ہے۔ آپ کہیں تو غزالہ بھابی کو فون کر رات کے کھانے پر بلا لوں۔"

"چھوڑیئے، اب کیا بلائیں۔ شمع بانو کہنے لگیں۔ اس بار میں کوئی ڈیسیزن نہیں لے سکی۔ آپ گھر پر ہوتے تو ہم ضرور ایک چھوٹی سی پارٹی کا انتظام کرتے۔ جانے دیجئے، اگلا جنم دن ہم خوب دھوم دھام سے منائیں گے۔" شمع بانو کہنے لگیں۔

"اگلے جنم دن پر ہم لوگ اس کے ساتھ نہیں ہوں گے۔"

"کیوں......؟"

"کیوں کیا؟ سال لگنے کو ہے اب یہ کوئی اجنبی تو رہا نہیں۔ شہر کی ہر گلی کوچے سے بخوبی واقف ہے۔ آخر کب تک یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ دیکھو...... راشد!" اُنہوں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگے......

''میں تم کو ہفتہ بھر کی مہلت دے رہا ہوں۔ کسی جگہ اپنا ڈیرا لے لو۔ تم کہو تو میں اس کام میں تمہاری مدد کر دوں؟''

''نہیں انکل! میں خود ڈیرا لے لوں گا۔ آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کہیں نہیں جائے گا، راشد!'' شمع بانو نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''اس کی وجہ سے گھر میں تھوڑی رونق ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ......''

''دُنیا سورج سے روشن ہے تو کیا ہم اُس کو روک پاتے ہیں؟ اور سورج غروب ہو جاتا ہے۔''

''راشد سورج نہیں ہے......!''

''میں جانتا ہوں کہ راشد تو سورج نہیں ہے، لیکن آپ کی نظر سے دیکھا جائے تو راشد ہی اس گھر کی رونق ہے۔ یہ یہاں سے چلا جائے گا تو گھر کی رونق چلی جائے گی۔ اس لئے آپ نہیں چاہتیں کہ یہ اس گھر سے کہیں دُور چلا جائے۔''

''میں نے تو ایسا نہیں کہا......!'' شمع بانو نے چڑھ کر کہا۔

''آپ نے ایسا نہیں کہا، لیکن آپ کے کہنے کا مطلب تو یہی ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ؟''

''انکل ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں، آنٹی......!''

''وہ تم کو یہاں سے جانے کے لئے کہہ رہے ہیں اور تم کہتے ہو کہ انکل ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔''

''آپ کو اس بیچ میں بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ گھر میرا ہے اور اس گھر پر میرا پورا اختیار ہے۔ یہاں کسی اور کی منمانی نہیں چلے گی۔ میری مرضی کے بغیر یہاں کوئی نہیں رہ سکتا ہے۔ ایک پل بھی نہیں۔ اب اس بارے میں کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ میں نے جو کہہ دیا، سو کہہ دیا۔''

پروفیسر شاہ عالم نے ذرا اونچی آواز میں کہا اور پھر وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔

اس رات کو جب وہ بستر پر گئے تو عجیب سی بے چینی کا انہیں احساس ہوا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ گرمی کی رات تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بہہ رہی تھیں۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی، ساری رات چٹکیوں میں نکل جاتی، لیکن ان کی آنکھوں میں نیند کا ذرا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ بس یونہی بستر پر پڑے پڑے خود کو جلاتے رہے اور رات کسی چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی۔ شمع بانو کی آنکھوں سے بھی نیند نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک یونہی پڑی رہیں پھر کروٹ بدل کر اُن کی طرف دیکھا۔ انہیں لگا کہ پروفیسر صاحب نیند کی آغوش میں ہیں، وہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے گھنگھریالے بال پنکھے کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا اور بستر سے نیچے اُتر گئیں۔ پھر دھیرے دھیرے پاؤں دبا کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر صاحب بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی چور کا پیچھا کر رہے ہوں۔ راشد کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا۔ شمع بانو اس کے کمرے کے اندر داخل ہوئیں اور برابر سے دروازہ بند کر دیا۔ پروفیسر صاحب دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ کان اسی طرف لگا تھا۔

''تم، برآمدہ میں کیا لینے کے لئے گئے تھے، راشد؟'' اندر سے شمع بانو کی آواز سنائی دی۔

''وہ...... وہ میں۔'' راشد کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر بولا ...... ''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں برآمدے میں گیا تھا؟''

''میرے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ تم برآمدے میں آنا جانا کر رہے ہو۔ میں نے سوچا کہ تم کو آواز دوں، لیکن پروفیسر صاحب کی وجہ سے خاموش رہی۔ پتہ نہیں ان کو کیا ہو گیا ہے؟ ہر وقت ان کا موڈ ہی آف رہتا ہے۔ پہلے وہ میری چھوٹی بڑی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اب ہر بات پر چڑھ جاتے ہیں۔ میرے کام میں عیب نکالتے ہیں۔

میں سنجیدگی سے کوئی سوال کرتی ہوں تو وہ جھلا کر جواب دیتے ہیں۔غزالہ بھابی کہا کرتی تھیں کہ تمہارے بھیا مجھے بات بات پر ڈانٹتے رہتے ہیں تو اس وقت مجھے بڑی حیرانی ہوتی تھی۔ پروفیسر صاحب تو کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوتے، ڈانٹنا تو دُور کی بات رہی، اُنہوں نے آنکھ اُٹھا کر بھی کبھی مجھ کو نہیں دیکھا۔ میں جو کہتی تھی، جیسا کہتی تھی ویسا ہی کرتے تھے۔ مجھ سے پوچھے بغیر وہ کوئی بھی کام کرنے میں ہچکچاتے تھے۔میری ہاں میں ہاں ملانا اُن کی عادت بن چکی تھی۔ بات بات پر مجھے برتری کا احساس دلاتے تھے، لیکن اب......؟''

''آپ دونوں میں جو اَن بن شروع ہوئی ہے، شائد اس کی وجہ میں ہوں۔''

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ لیکن تم کو لے کر کوئی من مٹاؤ ہوا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

''ایسا ہی ہے، آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ ہمارے بیچ کی نزدیکیاں ہی ان کے غیض و غضب کی وجہ ہے۔''

''اللہ جانے وجہ کیا ہے؟'' انہوں نے اچنبھے پن سے منہ بنایا۔ ''کہیں میں نے انجانے میں کوئی ایسی بات تو نہیں کہہ دی جس کی وجہ سے وہ خفا ہو گئے ہیں۔''

''اگر ایسی کوئی بات ہے تو آپ نے بہت بڑی بھول کی ہے۔''

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، تم اطمینان رکھو۔ میں بھول سے بھی اس بارے مین کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی......''

''تو پھر وہ آپ سے خفا کیوں ہیں؟''

''یہی تو میں بھی جاننا چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے خفا کیوں ہیں۔ پہلے تو میں یہ سوچتی رہی کہ وہ مجھ سے نہیں، اپنے آپ سے ناراض ہیں...... پھر مجھے اِس بات کا احساس ہوا کہ وہ خود سے نہیں بلکہ ہم سے ناراض ہیں۔''

''کچھ بھی ہو، آپ کو اتنی رات گئے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔''

''کیوں نہیں آنا چاہئے؟''

''انکل کو اگر معلوم ہو گیا تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔''

''وہ سو رہے ہیں اور اگر جاگ بھی گئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ انہیں جو کہنا تھا سو کہہ دیا، اب اس کے آگے کیا کہیں گے؟''

''انکل نے کچھ غلط نہیں کہا ہے۔''

''غلط سہی میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔''

''جانا تو پڑے گا ہی۔ اگر نہیں گیا تو انکل کی ناراضگی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کو اُن سے بُرا بھلا سننا پڑے۔''

''وہ جو بھی کہیں گے، جتنا بھی غصہ کریں گے، میں سہ لوں گی۔ لیکن تمہارے بغیر...... نہیں میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''رہنا ہی پڑے گا۔ اِس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے ہمارے پاس۔''

''پھر وہی بات، میں نے کہا، نا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔''

''اور اگر اُنہوں نے دوبارہ جانے کے لئے کہہ دیا تو......؟''

''نہیں کہیں گے۔ میں ان سے بات کرلوں گی۔''

''کیا کہیں گی آپ......؟''

''کچھ نہ کچھ تو بہانہ بنالوں گی۔''

''پر وہ نہیں مانیں گے۔''

''پھر بھی میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔ یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے۔''

''آپ نے سوچا ہے کہ اِس کا انجام کیا ہوگا؟''

''انجام کی مجھے کوئی پرواہ نہیں، میں بس اتنا جانتی ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو گے۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ آپ بیکار ہی ضد کر رہی ہیں۔''

''میں ضد نہیں کر رہی ہوں، راشد......! میں تو تم سے یہاں رہنے کی گزارش کر رہی ہوں۔ میں تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ ایک پل بھی تم سے دُور نہیں رہ سکتی۔ تم چلے جاؤ گے تو میرا کیا ہوگا؟ تم نے کبھی سوچا ہے۔''

''یہی سب کچھ سوچ کر تو میں یہاں سے جانے کو تیار ہوں۔''

''مت جاؤ، پلیز......!'' ان کی آواز میں خوشامد بھی تھی اور بیقراری بھی شامل تھی۔

''پھر وہی بات......'' راشد نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر ڈیرا بدل بھی لیا تو اس میں کیا ہرج ہے؟ دُور رہنے سے ہمارا پیار تو کم نہیں ہو جائے گا۔ ویسے بھی ہماری محبت اندھی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوں یا نہ ہوں، ہمارا پیار ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو...... یہ بتایئے کہ آپ یہاں کس لئے آئی تھیں؟''

''اتنی رات گئے میں تم کو ہال میں دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی۔ سوچا کہ صبح تم سے پوچھ لوں گی، لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا اس لئے چلی آئی۔''

''میں تو وہاں ''بام'' لانے کے لئے گیا تھا۔ صبح ہی سے میری گردن میں درد ہے۔ درد کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ''بام'' لگا لوں تو شائد کچھ آرام مل جائے۔''

''گردن میں درد کیسے ہو گیا؟''

''پتہ نہیں شام ہی سے درد کا احساس ہو رہا ہے۔''

''تم نے ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، بام لگا لوں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

''لاؤ میں لگا دیتی ہوں۔''

''نہیں...... میں خود لگا لوں گا۔''

''ایسے کیسے لگالو گے۔ لاؤ میں مالش کر دیتی ہوں۔ فوراً ہی آرام مل جائے گا۔''

اِتنا سننا تھا کہ پروفیسر صاحب دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ ایسا تھا جیسے اُنہوں نے کوئی گناہ کیا ہو۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنا چاہ رہے تھے کہ ان کی نظر دریچے پر پڑی۔ اُنہوں نے دریچے کے سوراخ سے اندر جھانک کر دیکھا۔ شمع بانو بستر پر پیر پھیلا کر بیٹھی ہوئی تھیں اور راشد کا چہرہ ان کی گود میں چھپا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی گردن میں 'بام' لگا رہی تھیں۔

باتوں کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن وہ دونوں کیا بول رہے تھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پروفیسر صاحب اپنے کمرے میں واپس آکر بستر پر لیٹ گئے۔ ان کے چہرے پر غصہ بھی تھا اور نفرت بھی...... ''ایک عورت اتنا گر بھی سکتی ہے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ شمع کا یہ چھچھورا پن...... میں سمجھتا تھا کہ یہ ایک سیدھی سادی، گھریلو اور دیندار عورت ہے۔ لیکن یہ عورت تو عیاش نکلی...... آدمی کو پہچاننا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہوتا ہے۔ کیا کچھ نہیں دیا میں نے اس کو...... مگر وہ آوارہ، بدچلن...... آج مجھے اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی نفرت ہو رہی ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آدمی سات بار جنم لیتا ہے، پر میں تو دیکھ رہا ہوں کہ ایک ہی جنم میں آدمی طرح طرح کا رُوپ بدل رہا ہے۔'' وہ آگے بھی کچھ بڑبڑا رہے تھے کہ شمع بانو کی آمد کا احساس ہوا۔ پروفیسر شاہ عالم ڈرامائی طور پر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ وہ کمرے کے اندر آئیں اور ہتھیلی پر اپنا سر رکھ کر پلنگ کے آخری سرے پر لیٹ گئیں جیسے ان کے ساتھ کوئی غیر مرد سو رہا ہو۔

صبح وہ کس وقت اُٹھے، کہاں گئے، کچھ نہیں معلوم؟ شمع بانو صحن میں ادھر سے اُدھر چہل قدمی کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بے چینی کے آثار صاف نمایاں تھے۔ راشد کچھ دیر تک یوں ہی دیکھتا رہا پھر قریب آکر بولا-----

''کیا ہوا؟ آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں؟''

''ہاں! تمہارے انکل کو لے کر پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اِتنا بدل کیوں

گئے ہیں؟ ان میں اِس قدر تبدیلی کیوں کر آگئی ہے؟ روزانہ صبح کی نماز کے لئے مجھ کو جگاتے تھے، لیکن آج اُنہوں نے نہیں جگایا۔ نماز کے بعد چائے پینے کے لئے بھی گھر نہیں آئے۔ میں صبح ہی سے ان کا انتظار کر رہی ہوں۔ چائے کا وقت نکل گیا تو باورچی خانے میں جا کر ان کی پسند کا ناشتہ بنایا۔ یہ سوچ کر کہ کسی طرح ان کا موڈ ٹھیک ہو جائے، لیکن وہ تو گھر آئے ہی نہیں۔ دس بجنے کو ہے اب تک کچھ پتہ نہیں۔''

''وہ تو آئے تھے......!''

''آئے تھے......مگر کب؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے۔''

''میں نے تو ان کو نہیں دیکھا......!''

''شائد آپ اس وقت کچن کے اندر تھیں۔ وہ آئے اور چلے گئے۔'' راشد نے بتایا۔

''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں؟''

''وہ بہت جلدی میں تھے اور ان کا موڈ بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ اس لئے میں نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''کم سے کم مجھے ہی بلا لیا ہوتا۔'' شمع بانو کے چہرے کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ''کہاں گئے ہوں گے؟ مجھ سے کہے بغیر وہ کہیں نہیں جاتے، جاتے بھی ہیں تو فون سے بتا دیتے ہیں۔ لیکن آج......ان کا فون بھی نہیں لگ رہا ہے۔'' انہوں نے کافی بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

شام ہو چکی تھی۔ آسمان میں ایک طرف بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے تھے تو دوسری طرف ڈوبتے ہوئے سورج کی بجھتی ہوئی کرنوں کی سرخی......سیاہ، سرخ اور نیلے رنگ میں ڈوبا ہوا آسمان کا عکس زمین پر بھی پڑ رہا تھا۔ زمین کی رنگینی بھی کچھ کم نہیں تھی۔ باغ میں بیلی، جوہی اور گلاب کے پھول کھلے تھے۔

تھوڑی دیر پہلے ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی۔ موسم نہایت ہی خوشگوار تھا۔ شمع بانو باغ کے چبوترے پر بیٹھی تھیں۔ ان کا ذہن کہیں اور تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ اوران کی نظریں دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ دل میں برے برے خیالات آرہے تھے۔ پروفیسر صاحب نہ جانے کہاں چلے گئے؟ کہیں وہ مجھ سے دُور تو نہیں چلے گئے؟ نہیں وہ مجھ سے دُور نہیں جا سکتے۔ مجھ سے دور جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ جب کبھی میں اُداس ہوتی تھی تو وہ کہتے تھے کہ ''آپ کے چہرے پر مایوسی اچھی نہیں لگتی ہے۔ آپ ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ آپ کی ہنسی آپ کے چہرے پر ہی نہیں اس گھر میں بھی بہار لاتی ہے۔'' وہ مجھے ہنسانے کا بہانہ ڈھونڈ تے تھے۔ پتہ نہیں اب اُنہیں کیا ہوگیا ہے۔ ان میں اتنی تبدیلی کیوں آگئی؟ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ مجھ سے بدگماں ہو سکتے ہیں، لیکن ...... وہ گئے تو کہاں گئے؟

کہیں ان کا ایکسیڈنٹ تو نہیں ہوگیا؟ ان کے دل و دماغ میں طرح طرح کے وسوسے آرہے تھے۔ اوران ساری باتوں کو سوچ کر اُن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایسا لگنے لگا جیسے واقعی ان کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی ہو۔ پھر وہ خود ہی اپنے آپ کو تسلی دینے لگیں۔ سارا شہر پروفیسر صاحب کو جانتا ہے۔ اگر ایسا کچھ ہوا ہوتا تو اب تک ضرور اس کی اطلاع مل گئی ہوتی۔ دل اور زیادہ مغموم ہوگیا، بے چینی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ وہ یہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ اچانک زور کی ہوائیں چلنے لگیں۔ بجلی چمکی، بادل گرجا اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ شمع بانو اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ تنہائی میں بارش کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ یہ آواز ان کو ایک پل نہیں بھا رہی تھی۔ کانوں کو ناگوار لگ رہی تھی۔ وہ پروفیسر صاحب سے کہیں زیادہ بارش کے تھمنے کا انتظار کرنے لگیں۔ بارش کی رفتار کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا صحن پانی سے بھر گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک تیز بارش ہوئی پھر آہستہ ہوگئی اور کچھ دیر کے بعد بالکل تھم گئی۔ بارش کے تھمنے کی دیر تھی کہ ہوا بھی رک گئی۔ آسمان بالکل صاف ہوگیا تھا۔

شمع بانو نے اپنے کمرے سے باہر نکل کر زینے کا رُخ کیا اور بالکونی میں آکر بیٹھ گئیں۔ وہاں سے سڑک صاف دکھائی دیتی تھی۔ ان کی نظریں سڑک پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ بارش کے رُکنے کے بعد راشد دفتر سے گھر آیا۔ اس نے اپنے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کئے اور شمع بانو کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا...... انکل آئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں......!''

''آپ نے فون کیا تھا؟''

''فون تو کیا تھا پر اُنہوں نے رسیو نہیں کیا۔''

''دوبارہ کال کر کے دیکھیں۔''

''میں نے کئی بار کوشش کی...... اُنہوں نے میرا کال رسیو نہیں کیا۔''

''آپ کہیں تو میں بات کروں......؟''

''نہیں...... تم کرو گے تو ان کا غصہ اور زیادہ بڑھ جائے گا۔''

''ایک بار تو ٹرائی کر کے دیکھتا ہوں۔''

''نہیں راشد...... ! اِس معاملے میں تم کوئی دخل اندازی نہیں کرو گے۔ ان کی ناراضگی کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو مگر کل رات تمہارے جانے کی بات کو لے کر بات اتنی آگے بڑھی ہے۔ اس لئے تم ان سب باتوں سے دُور ہی رہو تو اچھا ہے۔''

راشد نے کچھ نہیں کہا، سر جھکا کر یونہی خاموش بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں اس گھر سے چلا جاؤں۔ میں چلا گیا تو شائد اس گھر کی خوشی پھر سے لوٹ آئے گی۔ لیکن کیا میرے بغیر وہ رہ پائیں گی؟ اُنہیں دونوں میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا۔ پر کس کو؟ ابھی ابھی تو میں ان کی زندگی میں آیا ہوں۔ پروفیسر صاحب کا ساتھ تو نہ جانے کب سے ہے؟ مجھے جلد ہی کہیں اور ڈیرا لینا ہوگا۔

میں اپنے دوست کے پاس جاتا ہوں ۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا مکان خالی ہے اگر کرائے کے مکان کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہنا۔ وہ کچھ دیر تک یونہی بیٹھا رہا پھر اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہ ہی رہا تھا کہ اسی درمیان پروفیسر شاہ عالم ان کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ راشد اس وقت اسی جگہ پر بیٹھا تھا جہاں پروفیسر صاحب اکثر و بیشتر بیٹھا کرتے تھے۔ اپنی جگہ پر اس کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر وہ بے قابو ہو گئے۔ غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ حالانکہ اُنہوں نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی نظروں نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

''آپ...... آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ میں کب سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ کس وقت ڈیوٹی پر گئے تھے مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔ صبح آپ نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کہ آپ مجھ سے بے حد ناراض ہیں۔''

پروفیسر شاہ عالم نے ان کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ چند سکنڈ تک یوں ہی کھڑے رہے پھر بیگ سے ایک لفافہ نکالا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔

''کیا ہے یہ......؟'' شمع بانو نے پوچھا۔

''طلاق کے کاغذات ہیں......!''

''طلاق کے کاغذات؟'' ان کی آواز میں حیرانگی تھی۔

''ہاں......! ایک میرے لئے ہے اور ایک آپ کے لئے...... آپ دستخط کر دیجئے پھر میں کروں گا۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ پورے جسم سے ایسا کانپ اُٹھیں جیسے کسی نے ان کی روح قبض کرنے کی بات کہی ہو۔ وہ صبح سے بھوکی تھیں اور کافی پریشان بھی۔ ان کا سر چکرانے لگا۔ اچانک ساری دُنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ چند لمحوں کے لئے ایسا لگا جیسے چکرا کر زمین پر گر جائیں گی۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور بولیں------

''کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ؟ آپ کا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے۔''

''کاش! میرا دماغ ہی خراب ہو گیا ہوتا تو آج مجھ کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''وہی جو آپ سننا نہیں چاہتیں، یا پھر جان بوجھ کر انجان بن رہی ہیں۔''

''میں...... میں کچھ سمجھی ہی نہیں......؟''

''کاغذ پر دستخط کر دیجئے، سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا......!''

''کیسے کروں دستخط؟ آخر میرا قصور ہی کیا ہے؟''

''میں جانتا تھا کہ طلاق کا نام سن کر آپ ایسا ہی کچھ کہیں گی۔ روئیں گی، گڑگڑائیں گی، مجھ سے معافی مانگیں گی، لیکن میں آپ کی ایک بھی نہ سنوں گا۔ چپ چاپ دستخط کیجئے اور نکل جائیے میرے گھر سے۔''

''کہاں جاؤں گی میں......؟'' ان کی آواز میں کچھ زیادہ ہی بے بسی تھی۔

''اپنے اس عاشق کے پاس۔'' انہوں نے حقارت سے مُنہ بنا کر راشد کی طرف دیکھا۔

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، انکل؟'' راشد بوکھلا گیا۔

''خبردار......! میں تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔ جاؤ...... اپنی اس محبوبہ کے ساتھ رنگ رلیاں مناؤ۔'' ''کتنا گندہ اور نیچا خیال ہے، آپ کا۔'' شمع بانو نے نفرت سے اپنا منہ بنایا۔ ''میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ آپ کا سوچ اتنا گھٹیا ہوگا۔ کم سے کم میری عمر ہی کا تو کچھ خیال کیا ہوتا۔''

''اپنی عمر کا فائدہ اُٹھا کر آپ مجھے تو بے وقوف بنا سکتی ہیں، دُنیا کو نہیں۔ گھبرایئے نہیں، میں آپ سے کچھ نہیں دریافت کروں گا۔ لیکن دُنیا......؟ دنیا والوں کو آپ کیا جواب دیں گی؟ آج ہر کسی کی زبان پر آپ ہی کے چرچے ہیں۔''

''دُنیا جائے بھاڑ میں، مجھے دُنیا کی قطعی پروانہیں۔ لیکن آپ کے گندے سوچ پہ مجھے گھن آ رہی ہے۔''

''آپ اِس کے ساتھ ہنسی مذاق کر سکتی ہیں، گھومنے پھرنے کے لئے جا سکتی ہیں، اپنے ہاتھوں سے کھلا سکتی ہیں، اپنی گود میں لٹا سکتی ہیں اور اگر میں نے کچھ کہہ دیا تو میرا سوچ گھٹیا اور گندہ ہو گیا۔''

شمع بانو نے اپنا سر جھکا لیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں ایک بے وقوف انسان ہوں۔ میرے ہی گھر میں میرے نام پر اس کے ساتھ گلچھرے اُڑائیں اور میں برداشت کر لوں گا۔ کبھی نہیں ...... جایئے میرا گھر خالی کیجئے۔ آپ لوگوں کی وجہ سے اِس گھر کی زمین بھاری ہو گئی ہے۔'' پروفیسر صاحب آپے سے باہر ہو کر بول پڑے۔

''کہاں جاؤں گی، میں؟'' اُنہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''اپنے اس عاشق کے ساتھ۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خوبصورت بھی ہے اور جوشیلا بھی۔''

''لوگوں نے کہا اور آپ نے مان بھی لیا۔ میں کہتی ہوں کہ کچھ سننے اور کہنے سے پہلے ایک بار مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔''

''میں تمہاری صفائی میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ جتنی جلدی ہو سکے، آپ میرے گھر سے نکل جایئے۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے گھر سے چلی جاؤں...... تو میں چلی جاؤں گی، لیکن جانے سے پہلے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ کم سے کم اِتنا تو حق دیجیے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکوں۔'' اُنہوں نے گڑگڑا کر اِلتجا کی۔ پروفیسر صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ منہ پھیر کر یونہی کھڑے

رہے۔ شمع بانو کچھ دیر تک پتھر کی مورت بنی کھڑی رہیں پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر ہچکچاتے ہوئے بولیں------ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے کہوں؟ آپ کی نظروں میں میری اتنی گھناؤنی تصویر بن گئی ہے اور مجھے اِس بات کا احساس بھی نہیں ہوا۔ کم از کم میری بات تو سن لیجیے۔

انسان جب کسی کی نظروں سے گر جاتا ہے تو دوبارہ اُٹھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پر میں آپ سے کہوں تو کیا کہوں؟ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جس کا مطلب سمجھا پانا بہت مشکل ہے۔ بس اِتنا جان لیجیے کہ راشد میری اولاد جیسا ہے۔''

''اولاد جیسا ہے؟ اولاد میں فرق ہوتا ہے۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ راشد میری ہی اولاد ہے تو آپ کو یقین آئے گا؟''

''آ......آپ کی اولاد......؟'' پروفیسر صاحب کے چہرے پر بوکھلاہٹ طاری تھی۔

''ہاں......! راشد میری ہی اولاد ہے۔ ماں ہوں میں اس کی......'' وہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی تاب نہ لا سکیں اور آنچل میں مُنہ چھپا کر سسکنے لگیں۔ پھر سسکنے کے درمیان کہنے لگیں---

''یہ میرا بیتا ہوا کل ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ میرے ماضی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔ لیکن......لوگ کہتے ہیں کہ گیا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا، سبھی کہتے ہیں۔ پر وقت ہمارے ساتھ جو کھیل کھیلتا ہے اس کا نتیجہ کب سامنے آجائے کوئی نہیں جانتا۔''

پروفیسر شاہ عالم پر سکتہ طاری تھا اور وہ سر جھکا کر کھڑے تھے۔ شائد ان کا غصہ سرد پڑ گیا تھا۔

شمع بانو کچھ دیر تک روتی رہیں، پھر کہنے لگیں------

''میں اپنی داستان کی شروعات جہاں سے کروں گی وہیں سے میرا رونا بھی شروع ہو جائے گا۔ اب میں آپ سے کیا کہوں......شائد مجھے بہت پہلے ہی آپ کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔ کم سے کم اس وقت بھی جب راشد ہماری زندگی میں آیا تھا۔ لیکن ڈرتی تھی، میں نے کئی بار کوشش بھی کی، لیکن کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

''میری اماں نے آپ سے غلط کہا تھا کہ ہم لوگ کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم بہاری ہیں۔ بہار میں ایک چھوٹا سا شہر ہے، بھاگلپور...... ہم وہیں کے باشندے ہیں۔ زمانہ بیت گیا اس شہر کو چھوڑے ہوئے۔ یہاں آئی تو پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اُس طرف۔ خیر......'' انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور آگے کہنے لگیں------

''یہ اُس وقت کی بات ہے جب میری عمر لگ بھگ بیس سال تھی۔ مجھے ایک لڑکے سے پیار ہوگیا تھا۔ وہ لڑکا بھی مجھے دل و جان سے چاہتا تھا۔ بہت اچھا لڑکا تھا، اپنے گھر کا اکلوتا وارث...... والدین کو اس کی پسند سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ پر...... میری اماں! وہ چاہتی تھیں کہ میری شادی کسی سروس والے لڑکے سے ہو۔''

''نسیم اپنا بزنس کیا کرتا تھا۔ شائد اسی وجہ کر اماں کو وہ پسند نہیں تھا۔ اِس بات کو لے کر ہمیں کافی جدّ وجُہد کرنی پڑی۔ بہت مشکل سے اماں راضی ہوئیں۔ جس دن وہ راضی ہوئیں وہ دن ہمارے لئے بہت بڑا دن تھا۔ ہم آپے سے باہر ہوگئے اور غلط قدم اُٹھالیا۔''

شمع بانو نے ہونٹوں پر زبان پھیرا۔ وہ اندر سے پریشان ہی نہیں بے حد پشیمان بھی نظر آرہی تھیں۔ شائد یہ سوچ کر کہ آگے کی داستان کس طرح بیان کروں؟ تھوڑی دیر کے بعد وہ نحیف سی آواز میں بولیں------

''نسیم کو ایک چھوٹی سی کپڑے کی دکان تھی۔ وہ دکان جانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ سنڈے کو بھی دکان چلا جاتا تھا۔ اس روز بھی دکان چلا گیا تھا جس روز شہر کی حالت نازک بتائی جارہی تھی۔ ابھی دکان میں تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ شہر میں فرقہ وارانہ فساد برپا ہوگیا۔

اس نے اپنی دکان یونہی چھوڑ کر موٹر سائیکل نکالا اور گھر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ فسادیوں پر درندگی اِس قدر سوار تھی کہ اس کو موٹر سائیکل سے نیچے اتار کر زندہ جلا دیا۔

سارا شہر لہولہان ...... شہر کے ہر حصے میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ آسمان بھی لال دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے خون کے آنسو رو رہا ہو۔ کہیں نعرۂ تکبیر ''اللہ ہو اکبر'' کی آواز سنائی دیتی تو کہیں سے ''ہر ہر مہادیو'' کی گونج ...... سب ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے۔ صبح سے رات ہوگئی اور ظالموں کا ظلم برقرار تھا۔ بلکہ ظلم پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ نسیم کے گھر والے اس کی موت سے بے خبر تھے۔ ساری رات بیٹے کی راہ دیکھتے رہے۔ رات کا نظارہ کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ صبح پو پھٹتے ہی ماں نے بیٹے کی تلاش میں اس کے والد کو باہر بھیج دیا۔ وہ وقت یاد کرتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بہت ہی بے رحم گھڑی تھی۔ وہ بیچارے بوڑھے، بیمار، صحت سے لاغر ...... ظالموں نے پہلے تو اُن پر لاٹھیاں برسائیں پھر چھرے سے جگہ جگہ ایسا وار کیا کہ وہ وہیں تڑپ تڑپ کر ڈھیر ہوگئے۔ اور بیچاری ماں اپنے شوہر اور بیٹے دونوں سے محروم ہوگئی۔ روتے روتے ان کی آنکھوں کے نیچے گڈھے پڑ گئے تھے۔ ہر کسی کو ان سے ہمدردی تھی۔ پر ...... سوائے افسوس و ملال کے لوگ کر بھی کیا سکتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ لیکن میں ...... میرا زخم اُبھرتا ہی چلا گیا۔ اکیلے زندگی کی مسافت طے کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ مجھے اپنی حفاظت کے لئے ڈھال کی ضرورت تھی۔ لیکن میرا ڈھال تو ...... میں نسیم کی موت کا ماتم کیا مناتی، اپنی بے بسی کا رونا رونے بیٹھ گئی۔ کیسے کر پاؤں گی میں دُنیا والوں کا سامنا؟ یہ دُنیا کیا کہے گی؟ دُنیا والے کیا کہیں گے؟ گھر والوں پر کیا اثر ہوگا؟ اماں یہ سب کیسے برداشت کر پائیں گی؟

سارا دن میں یہی سوچ کر آنسو بہاتی رہتی تھی۔ ہر پل مجھے ایسا لگتا جیسے لوگ مجھ پر ہنس رہے ہوں، میرا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ مجھ سے کچھ پوچھ رہے ہوں، اور میں...... پھر وہ خاموش ہوگئیں۔ ان کی جھکی جھکی نگاہیں شرم وحیا کا احساس دلا رہی تھیں۔ شمع بانو چند سکنڈ تک یونہی اپنا ہونٹ کاٹتی رہیں پھر آہستہ سے بولیں------

''اماں مجھے بدنامی سے بچانے کے لئے لکھنو لے آئیں۔ وہاں ان کی خالہ زاد بہن رہا کرتی تھیں۔ وہاں جانے کے بعد ایسا لگا جیسے مجھے میرے غم سے نجات مل گیا ہو، مگر یہ میرا وہم تھا۔

غم سے نجات پانا میرے بس میں نہیں تھا۔ میری پریشانی تو دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اماں کبھی اپنی قسمت پر آنسو بہاتیں تو کبھی مجھے کوستیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اماں سے کچھ کہوں، کہتی بھی کیا، میں تو خود اپنے آپ سے نظریں ملانے کے لائق نہیں رہی تھی۔ ان دنوں میری کیا حالت تھی میں ہی جانتی ہوں۔ مجھ کو تاریکی کاٹنے کو دوڑتی تھی اور روشنی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ زندگی ایک بوجھ بن گئی تھی۔ اس بوجھ سے چھٹکارا پانے کا بس ایک ہی راستہ تھا، میری موت، جو میرے بس میں نہیں تھی۔ میں رات دن خدا سے یہی دعائیں مانگتی تھی کہ ''اے پروردگار! مجھے میری زندگی سے نجات دے دے۔ حالانکہ ہم اس شہر میں اجنبی تھے۔ ویسے بھی وہاں کے لوگوں کا کسی سے کوئی واسطہ نہیں تھا، ہر کوئی اپنی اپنی دُنیا میں مگن تھے، پر میں اپنی دنیا سے بہت دور چلی گئی تھی۔ سچ کہوں تو میری دنیا اسی دن ختم ہوگئی تھی جس دن نسیم کی موت کی خبر ملی تھی۔ میری زندگی تو موت سے زیادہ بدتر تھی، موت ایک بار آتی ہے، پر میں...... میں تو ہر پل گھٹ گھٹ کر مر رہی تھی۔۔ غزالہ بھابی میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔

میرے اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے کا ایسا انتظام کرتیں جیسے لوگ مہمان کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ان کی یہی کوشش رہتی کہ میں اپنی ذہنی اذیت سے دُور رہوں، جو میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ مجھے ہر وقت بھیا کے غصّے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ حالانکہ اس درمیان اُنہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، لیکن پھر بھی بھیا سے نظریں ملانے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ میں ان سے دُور دُور ہی رہنے لگی تھی۔ ابا اگر حیات ہوتے تو پتہ نہیں ان پر کیا گزرتی؟ اماں بار بار یہ ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں، لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو پاتی تھیں۔ لاکھ کوشش کرلے...... ایک ماں اپنے بچے سے نفرت کر ہی نہیں سکتی۔ اماں دن بھر میں کئی بار مجھ کو برا بھلا کہتیں، مجھ پر غصہ ہوتیں اور جب میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھتیں تو میرے چہرے کی مایوسی دیکھ کر فوراً سرد پڑ جاتی تھیں۔ کہتیں...... ''تجھے اس حال میں دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں اور میرا خدا جانتا ہے۔ میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتی۔ کیا کروں؟ تو نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں۔ اتنی بڑی مصیبت مول لے لی ہے کہ کوئی چاہ کر بھی تیرا کچھ نہیں کرسکتا۔

کسی طرح اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے تو پھر میں تیری زندگی کی شروعات نئے سرے سے کروں گی۔ اس بار تیری مرضی نہیں چلے گی، تو نے اپنی من مانی کرلی، اب میں جو چاہوں گی، جیسا چاہوں گی ویسا ہی ہوگا۔'' میں کیا کہتی، میں تو ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی۔ گھر کی چہار دیواری کے اندر بند کمرے میں قید اپنی اُداسیوں، غموں اور تنہائیوں کا ماتم مناتی رہتی تھی۔ آخر کار وہ دن آ ہی گیا جس دن کے خوف نے مجھے ہر پل آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔

عورت کے لئے وہ دن کتنا اہمیت رکھتا، کتنے ناز نخرے ہوتے ہیں اس کے، لیکن میں......؟ میرے لئے تو ہر لمحہ پہاڑ جیسا بھاری تھا۔ میرے لئے اماں بہت زیادہ پریشان تھیں۔ سچ کہوں تو اماں کو مجھ سے کہیں زیادہ میرے آنے والے کل کی فکر تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ دنیا والوں کی نظریں مجھ پر پڑیں۔ آخر آخر تک بھی اُنہوں نے مجھے لوگوں کی نظروں سے بچا کر رکھا۔ شائد یہی وجہ تھی کہ اماں گھر کے سامنے والی لیڈی ڈاکٹر کی کلینک نہیں، دُور کے اسپتال میں لے گئی تھیں۔ وہیں میں نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اماں نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے۔ لیکن وہ بچہ مرا ہوا نہیں زندہ تھا۔ غزالہ بھابی کی مدد سے نسیم کی ماں لکھنؤ آئیں اور اس بچے کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئیں۔ اور مجھ کو اِس بارے میں کوئی جانکاری نہیں تھی۔ میں تو یہی سمجھتی رہی کہ وہ معصوم دُنیا میں آنے سے پہلے ہی چل بسا۔ پر ایک روز اچانک...... آپ کو یاد ہے چند ماہ پہلے آپ بہت بیمار ہو گئے تھے۔ راشد نے آپ کی بے حد تیمارداری اور خدمت کی تھی۔ لیکن مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ راشد کا اِس طرح ہمارا ساتھ دینا...... میں نے غزالہ بھابی سے کہا تھا کہ اس لڑکے کے اپنے پن میں مجھے چاپلوسی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ خوشامد اور چاپلوسی مجھے ہرگز پسند نہیں۔''

''راشد چاپلوسی نہیں کرتا، اس کا اخلاق ہی ایسا ہے۔''

''کچھ بھی ہو بھابی! کسی اجنبی کا اِس طرح ہماری زندگی میں آنا......''

''وہ اجنبی نہیں ہے، شمع......! وہ تو......'' اور بھابی کچھ کہتے کہتے رُک گئی تھیں۔ اُنہوں نے مجھے ایک خط دیا تھا۔ وہ خط نسیم کی اماں نے میرے لئے لکھا تھا:

''بیٹی...... میں تمہاری گنہگار ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔ کاش کہ تم میرے سامنے ہوتی اور میں مرنے سے پہلے تم سے معافی مانگ لیتی۔ یہ لڑکا تمہارا ہے اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔ میں نے تو بس تمہاری امانت سمجھ کر اس کی پرورش و پرداخت کی ہے، میں ہمیشہ اِس فکر میں رہی کہ تمہاری امانت تم تک پہنچا دوں۔ لیکن ڈرتی تھی کہ اس کی وجہ سے تمہاری زندگی میں کہیں کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔ میں نے اس کو بہت ہی محنت سے پالا پوسا ہے۔ زمانے کی سرد گرم ہواؤں سے ہمیشہ بچا کر رکھا ہے۔ ذرا سی سردی یا گرمی لگ جاتی تھی تو میں بری طرح سے بے چین ہو جاتی تھی۔ سچ کہوں تو ماں اور باپ دونوں کے فرائض نبھائے ہیں۔ میں نے اس کو پڑھا لکھا کر لوگوں کے سامنے کھڑا ہونے کے لائق بنایا ہے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ تم سے ملا دوں۔ لیکن تمہاری شادی شدہ زندگی میں کوئی آنچ نہ آئے، یہی سوچ کر منہ موڑ لیا کرتی تھی۔ راشد اپنے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ بڑا ہی نیک اور فرماں بردار لڑکا ہے۔ چھوٹی سی عمر میں ہی عقل آ گئی، اس نے کبھی مجھے پریشان نہیں کیا۔ شائد ہی کبھی کسی چیز کے لئے ضد کی ہو۔ میں نے ہمیشہ ہی اس کے سامنے تمہاری تعریفیں کی ہیں۔ پتہ نہیں سہی کیا یا غلط؟

لیکن ہاں! مرنے سے پہلے تم کو تمہاری امانت لوٹا رہی ہوں۔

اُمید ہے کہ تم مجھ کو معاف کر دوگی۔

تمہاری بدنصیب چچی

جہاں آرا

شمع بانو نے خط پڑھ کر ان کی طرف بڑھانا چاہا، لیکن ان کو ہمت نہیں ہوئی۔

خط کو میز پر رکھ کر بولیں------

''اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مرنے سے پہلے اماں بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ کہہ نہیں پائیں۔ خیر...... آپ نے مجھے اِس قدر پیار دیا ہے کہ آپ کی نفرت برداشت نہیں کر سکی۔ چنانچہ سچائی بتانے پر مجبور ہو گئی۔ اب میں جہاں بھی رہوں گی، آپ کی نفرت کا مجھے احساس نہیں ہوگا۔ پیڑ کی شاخ جتنی بھی موٹی اور گھنی کیوں نہ ہو پیڑ سے الگ ہونے کے بعد سوکھ جاتی ہے اب آپ سے الگ ہونے کے بعد میں بھی...... میں اپنے بیٹے راشد کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اس لئے نہیں کہ مجھے آپ کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ آپ ہی نے مجھے اپنے سے دُور کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں جہاں بھی رہوں گی، آپ کی یادیں ہر وقت میرے ساتھ رہیں گی۔ آپ یہی چاہتے ہیں نا کہ راشد یہاں سے چلا جائے۔ لیجئے...... ہم یہ شہر ہی چھوڑ کر جا رہے ہیں تا کہ وہ راز، راز ہی رہے اور کسی کے سامنے نہ آئے جو راز آج سے پچیس ۲۵ سالوں تک میرے سینے میں دفن رہا۔ آپ کی زندگی میں آنے سے پہلے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا، جو کچھ تھا وہ میں کھو چکی تھی۔ آپ نے مجھے کیا کچھ نہیں دیا۔ نام، عزت، شہرت اور دولت...... اتنا سب کچھ ملنے کے باوجود بھی میں احساس کمتری کا شکار رہی۔ شادی کے بعد عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ماں بنے۔ اس کے گھر آنگن میں پھول کھلے، لیکن میں...... میری گود سونی رہ گئی۔ میں ہمیشہ یہی سوچتی رہی کہ یہ میرے گناہ کی سزا ہے۔ جانے انجانے میں نے بہت بڑی بھول کی ہے۔ میری یہ بھول شعوری تھی یا غیر شعوری آج تک میں سمجھ نہیں پائی۔ لیکن بھول تو میں نے کی ہے۔ ایک ایسی بھول جس کے بارے میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔

کہتی بھی کیا؟ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔

کبھی کبھی بچے کی لاش کی خیالی تصویر آنکھوں میں اُبھرتی اور میں اپنے آنچل کو اشکوں سے بھگو کر دل کو ضرور ہلکا کر لیا کرتی تھی۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ میں جس معصوم کی موت کا ماتم منا رہی ہوں وہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ خیر......''
اُنہوں نے ایک سرد آہ بھرا پھر کہنے لگیں------   ''یہ میری خوش نصیبی ہے یا بد نصیبی، میں نہیں کہہ سکتی ہوں۔ بس ایک آخری بات آپ سے کہہ رہی ہوں۔ خدا کے واسطے آپ مجھے طلاق مت دیجئے۔ میں سہاگن ہی مرنا چاہتی ہوں۔''   وہ آگے بھی کچھ کہہ رہی تھیں، لیکن ان کی آواز بھرا گئی۔ اُنہوں نے بے حد افسردہ اور غمگین نظروں سے پروفیسر شاہ عالم کی طرف دیکھا اور راشد کا ہاتھ پکڑ کر بڑی بے بسی اور لاچاری سے قدم اُٹھا کر آگے بڑھنے لگیں۔ لرزتے جسم میں جان کہاں؟ بڑی مشکل سے ان کے قدم اُٹھ رہے تھے۔ پاؤں بھی من من بھر کے بھاری ہوتے جا رہے تھے۔ پروفیسر صاحب نے نگاہیں اُٹھا کر ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔'' وہی بڑی بڑی بھوری آنکھیں، گھنگھریالے بال، لمبی گردن، شگفتہ ہونٹ، ماں کی طرح بیٹا بھی ہنستا تو آنکھوں میں پانی بھر آتا۔ اس کے بولنے کا انداز......اس کی پسند، سب کچھ تو شمع سے ملتی ہے۔ کاش کہ میں نے ان کی آنکھوں میں پہلے ہی جھانکا ہوتا۔ میری آنکھیں کمزور ضرور ہو گئی ہیں پر اتنی بھی کمزور نہیں ہوئی ہیں کہ میں چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ نہیں پاؤں۔ پتہ نہیں شمع کے چہرے کی شکن کو میں دیکھ کیوں نہیں پایا۔ کتنا نفرت کرتا تھا میں اس لڑکے سے، جب بھی وہ میرے سامنے آتا، میں اس کو برا بھلا ہی کہتا تھا۔ اس کا یہاں رہنا، شمع کے نزدیک جانا، مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں شمع سے بھی نفرت کرنے لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر طعنے مارنا، جھلا کر جواب دینا، ان کے ہر کام میں عیب نکالنا، میری عادت بن گئی تھی۔ میں یہ بات کیسے بھول گیا کہ کسی بات کا حل نکالنے کے لئے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ غصے میں یا نفرت سے کسی مسئلے کا حل نہیں نکالا جا سکتا۔ اب میں کیا کروں......؟ شائد اب بھی وقت ہے۔ اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو دوبارہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اگر یہ لوگ چلے گئے تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

تو پھر میں کیا کروں؟ میں ایک عزت دار انسان کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ سماج میں میرا بڑا بول بالا ہے۔ اگر اس بارے میں مجھ سے کسی نے کچھ پوچھ لیا تو میں کیا جواب دوں گا؟ میں لوگوں کی خاطر شمع کو دوبارہ اس غم کا حصہ دار نہیں بنا سکتا، جس غم سے اس کو اس کی ماں نے آزاد کرایا تھا۔ اگر آج میں نے ان دونوں کو یونہی چھوڑ دیا تو مجھ میں اور ان درندوں میں کیا فرق رہے گا، جنہوں نے شمع کو عمر بھر کے غم کا حصہ دار بنا دیا تھا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ وہ کئی لوگ تھے اور میں اکیلا...... ان لوگوں نے بھی شمع سے اس کی زندگی چھین لی تھی اور میں بھی...... نہیں، ایک عزت دار پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ میں ایک انسان بھی ہوں اور انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ میں انہیں گھر سے بے گھر ہونے نہیں دوں۔ یہی غلطی اگر مجھ سے سرزد ہوئی ہوتی تو شمع مجھے معاف کر دیتی، اس لئے نہیں کہ وہ میری شریک حیات ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی ایک عورت ہے، عورت کا دل نرم ہوتا ہے، بات کی گہرائی تک جانا، باتوں کو سمجھنا اور پھر سامنے والے کے سامنے نرم پڑ جانا عورت کی فطرت میں شامل ہے۔ جو کام وہ کر سکتی ہے، وہ میں کیوں نہیں؟ ایک بار تو ایسا کر کے دیکھتا ہوں۔ کسی کو معاف کر دینے میں کتنی راحت ملتی ہے۔" پروفیسر صاحب نے دو قدم آگے بڑھ کر لڑکھڑاتی آواز میں کہا ------

"رک جاؤ...... شمع، میں کہتا ہوں کہ رک جاؤ!"

شمع بانو نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور وہ رک گئیں۔ راشد کے قدم بھی تھم گئے تھے۔

"اس بوڑھے مجبور باپ کو اکیلا و تنہا چھوڑ کر جا رہے ہو......؟"

"باپ......؟" راشد نے استعجابیہ انداز میں اپنی پلکیں جھپکائی۔

"ہاں......! باپ! میں تمہیں باپ کہنے کا حق دیتا ہوں۔ کیا تم میرے بیٹے بننا پسند کرو گے......؟" راشد اُن کی باتیں سن کر سسکنے لگا۔ شمع بانو کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔ پروفیسر شاہ عالم دو قدم آگے بڑھے اور ان دونوں کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔!!

(ختم شد)

مختصر تعارف ادیبہ و مصنفہ ڈاکٹر یاسمین اختر

اصلی نام : یاسمین اختر

قلمی و ادبی نام : ڈاکٹر یاسمین اختر

جائے پیدائش : محلہ بھیکن پور۔۳، بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۱ (بہار)

والد کا نام : جناب محمد فخر عالم

والدہ کا نام : شمیمہ خاتون

تعلیمی لیاقت (۱) ایم۔اے۔ (اُردو)، تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپورے (بہار)

(۲) پی۔ایچ۔ڈی۔ تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی، بھاگلپورے (بہار)۔ سن ۲۰۱۳ء

موضوع: ''جدید اُردو افسانے میں تصورِ زن''

(۳) کمپیوٹر ٹیچر ٹریننگ۔

پیشہ (پروفیشن) : درس و تدریس

لکچرر۔ پی۔این۔اے۔ کالج، بھاگلپور۲ (بہار)

پہلی تخلیق : ''لوگ کیا کہیں گے؟'' (افسانہ)

ماہنامہ ''تعمیر ہریانہ''، چنڈی گڑھ۔ اگست ۲۰۰۱ء

تصانیف :(۱) گھر کی زینت (افسانوی مجموعہ)۔۲۰۱۴ء

(۲) آپ تو ایسے نہ تھے (ناولٹ) ۔۲۰۱۵ء

:(۳) ''سلسلہ'' . (افسانوی مجموعہ)

محکمۂ راج بھاشا، حکومتِ بہار کے مالی تعاون سے زیرِ طبع تصانیف

(۱) ''نذرانہ'' (افسانوی مجموعہ)

(۲) ''لوگ کیا کہیں گے؟'' ''

(۳) ''جینے کے لئے'' (ناولٹ)

(۴) ''فضاء'' (ناولٹ)

(۵) ''بہار آئے گی'' (ناول)

(۶) ''غالبؔ کا اُسلوب''

(شاعری اور نثر نگاری کے حوالے سے)

(۷) ''تبصرے اور تنقیدیں'' (مجموعہ مُضامین)

(۸) ''دس محاورے''

(ادب اطفال کے تحت بچوں کی کہانیاں)

========

AAP TO AISE NA THE

(Novelet)

By

Dr. Yasmin Akhtar

Printed : Saima Publication, Dariyapur, Ahmad Market, Patna-4